بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

معاشی مسئلہ کا قرآنی حل

روٹی کا مسئلہ

(علامہ غلام احمد پرویز کا ایک خطاب)

روٹی کا مسئلہ اگرچہ اس دن سے آدم کے ساتھ ہے جس دن اس نے اپنے ارضی مستقر پر آنکھ کھولی لیکن ہمارے زمانہ میں اس نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ افراد اور اقوام دونوں اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ مارکس اور لینن کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے وہ بھی اسی عالمگیر پریشانی کی وجہ سے ہے اور بساط سیاست پر روس جن توجیہات کا مرکز بن رہا ہے وہ بھی اسی مسئلہ کی پیدا کردہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سیاست' حکومت' تہذیب و تمدن' ملی مسائل اور بین الاقوامی معاملات' سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا یہ دعوئٰ ہے (اور یہ دعوئٰ ایمان پر مبنی ہے) کہ قرآن نوع انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے تو اس مسئلہ کا حل بھی ضرور ہونا چاہئے جس نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے اور جس کا تعلق انسان کی طبعی موت و حیات سے ہے۔ آج دنیا دو بڑے بلاکوں میں بٹ رہی ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جو اس نظام سرمایہ داری کی وارث ہیں جس نے نوع انسانی کو تباہی و بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ دوسری طرف روس کا بلاک ہے جس کے انسانیت سوز استبداد کے ہاتھوں خود وہاں کے

ارباب حل و عقد بری طرح چیخ رہے ہیں ان دونوں جہنموں کے درمیان مظلوم و مقہور انسانیت بری طرح سہمی کھڑی ہے۔ آج اگر کوئی قوم روٹی کے مسئلہ کا ایسا حل بتا دے جو نوع انسانی کو ان دونوں جہنموں سے نکال کر سلامتی کی جنت کی طرف لے جائے تو یقین مانئے کہ اقوام عالم کی امامت بلاتأمل اس کے حصہ میں آجائے گی۔ یہ تھا وہ شدید احساس جس کی بناء پر میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کے باب عالی پر دستک دی۔ اور یہ اس کی رحمت بے پایاں کا تصدق تھا کہ اس نے فقیر بے نوا کو اپنے دروازے سے محروم نہیں لوٹایا۔ مجھے جو راہنمائی قرآن سے حاصل ہوئی ہے میں اسے ایک عرصہ سے قوم کے ارباب فکر و نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ بایں امید کہ اگر وہ بھی قرآنی تدبر کے بعد مجھ سے متفق ہوں تو پھر ہم سب مل کر سوچیں کہ اس کی عملی تشکیل کی کیا صورت ہونی چاہئے۔ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کو نہ کبھی سہو و خطا سے مبرا خیال کیا ہے نہ حرف آخر سمجھا ہے۔

اس فکر کے عام کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ جو دیگر حضرات اپنی اپنی جگہ اس نہج پر غور و تدبر کر رہے ہوں وہ بھی اس کوشش میں میرے رفیق راہ بن جائیں تاکہ ہم سب مل کر منزل مقصود تک پہنچ سکیں۔

● ● ●

رزق کی ذمہ داری

قرآن میں ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔ یہ ایک بہت بڑا اعلان ہے اور بڑا عظیم دعویٰ۔ اس سے ذرا سمٹ کر خالص انسانی دنیا کی طرف آیئے تو وہاں ارشاد ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6:152) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کی اپنی اور ان کی اولاد کے رزق کی بہم رسانی خدا نے اپنے ذمہ لے رکھی ہے۔ صرف رزق (یعنی سامان زیست) ہی کی نہیں بلکہ اس نے اپنے آپ کو رب الناس کہا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطہ آغاز سے پرورش دیتے دیتے' بتدریج اس کے نقطہ تکمیل تک پہنچا دینا۔

لہذا رب الناس کا مفہوم یہ ہوا کہ ہر فرد انسانیہ کی صلاحیتوں کی مکمل نشوونما کی ذمہ داری بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس ذمہ داری کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے قرآن کی ابتدا ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے اعلان سے کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی ستائش اللہ کے لئے ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام اقوام عالم کی نشوونما کا ذمہ دار ہے۔ اس کی حمد و ستائش اسی بنا پر ہے کہ وہ تمام افراد انسانیہ کی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کا ذمہ دار ہے۔

ایک طرف تو برادران! یہ عظیم اعلان ہے کہ ہر متنفس کے سامان زندگی اور اسباب وذرائع نشوونما کی ذمہ داری خدا پر ہے لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ (انسانی صلاحیتوں کی نشوونما تو خیر بڑی چیز ہے) دنیا میں کروڑوں انسان ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں محض روٹی نہ ملنے سے تلف ہو جاتی ہیں۔ خود اپنے ملک پاکستان کو دیکھئے۔ اس میں کتنے انسان ایسے ہیں جو راتوں کو بھوکے سوتے ہیں۔ اس سے لامحالہ ایک سوچنے والے کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی یہ ذمہ داری کیسی ہے جس میں لاکھوں انسان بھوکے سوتے ہیں؟ آپ اس سوال سے آنکھیں بند کر کے گذر جائیں تو اور بات ہے لیکن اگر آپ ایک سیکنڈ کے لئے رک کر اس پر غور کریں تو آپ کے سامنے ایک مہیب سوال اٹھ کھڑا ہو جائے گا۔ جو ہو نہیں سکتا کہ آپ کے دل کو طلسم پیچ و تاب نہ بنا دے۔ میں عزیزان من! آپ سے گذارش کروں گا کہ آگے بڑھنے سے پیشتر آپ اس سوال کو اپنے دل میں دہرائیں اور سوچیں کہ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ آپ اس کا جواب بمشکل دے سکیں گے لیکن قرآن اس کا جواب آسانی سے دے دیتا ہے اور یہی ہے وہ جواب جس پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔

اس ذمہ داری کا مفہوم کیا ہے

وہ کہتا ہے کہ جہاں تک خارجی کائنات (باہر کی دنیا) کا تعلق ہے خدا کی ذمہ داری اس کے قانون کی رو سے پوری ہو رہی ہے جس سے کسی شے کو مجال سرتابی نہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (16:49) کائنات کی ہر شے قانون خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور یہ قانون ان کی نشوونما کی تمام ضروریات کو

پورا کئے چلا جاتا ہے۔ يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (55:29) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو بھی شے ہے وہ اپنی نشوونما کے لئے اس کی محتاج ہے اوران کی یہ احتیاج ایسی نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی جیسی رہے بلکہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (55:29) ہر شے ہر آن میں ایک نیا پہلو بدلتی ہے اس لئے اس کی نشوونما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کا قانون ربوبیت ان بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان کا سامان نشوونما بہم پہنچائے چلا جاتا ہے لیکن انسانوں کی دنیا میں حالت جداگانہ ہے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانون ربوبیت کو اختیار کرے اور چاہے تو اس سے سرتابی اختیار کر کے' اس کی جگہ اپنا نظام رائج کر لے۔ جب انسان اپنا نظام رائج کر لیتا ہے تو وہ پھر خدا کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو باہر لے آتا ہے۔ جب وہ اپنی زندگی اس کے قانون کے تابع لے آتا ہے تو اس کی ایک ایک ذمہ داری نہایت حسن کارانہ انداز سے پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ خدا براہ راست انسانوں کو رزق نہیں پہنچاتا بلکہ اس نظام کی وساطت سے پہنچاتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۃ یٰسین کی ایک آیت جلیلہ میں جامع طور پر بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (36:47) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں سامان زندگی دیا ہے اسے (دوسروں کی پرورش کے لئے) کھلا رکھو۔ تو وہ لوگ جو خدا کے قانون ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے ان لوگوں سے کہتے ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ کیا ہم اس شخص کے کھانے کا انتظام کریں جسے اگر اللہ چاہتا تو اپنے قانون مشیت کے مطابق خود ہی کھانا کھلا دیتا (ان سے کہو کہ) تم ایسا سمجھنے اور کہنے میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ خدا محتاج انسانوں کے کھانے کا انتظام از خود نہیں کیا کرتا۔ یہ انتظام اس نظام کی رو سے ہوتا ہے جس میں قانون خداوندی کے مطابق رزق کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دیا جاتا ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

نظام کے ہاتھوں

اب سوال یہ ہے کہ یہ نظام قائم کس طرح سے ہوتا ہے؟

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم کا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز ہے جسے انسانی ذات (Human personality) یا نفس (Self) یا انا یا ایغو کہتے ہیں۔ انسانی جسم' طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے اور انہی قوانین کے مطابق اس پر موت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو وہ طبعی موت سے مرتی نہیں بلکہ حیات جاوید حاصل کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کی زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما' انسانی زندگی کا مقصود ہے اور قرآن ایسا پروگرام عطا کرتا ہے جس سے اس کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا خود استعمال کرے لیکن انسانی ذات کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی جسم کی پرورش "لینے" میں ہوتی ہے اور انسانی ذات کی پرورش "دینے" میں۔ جو لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود صرف جسم کی پرورش ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جتنا کچھ سمیٹا جا سکے اپنے (اور اپنی اولاد کے لئے) سمیٹ کر رکھ لے۔ اسی کو نظام سرمایہ داری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں وہ اپنی ذات کی نشوونما کی فکر کرتے ہیں جس کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنی پوری پوری محنت سے سب کچھ حاصل کرے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکیں اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ اسے انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس اصول حیات پر یقین رکھتے ہیں انہیں جماعت مومنین کہتے ہیں۔ یہ جماعت ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں ہر فرد' فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے مصروف جدوجہد رہتا ہے۔ لیکن اپنی سعی و عمل کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے۔

اللہ سے معاملہ

جسے یہ نظام نوع انسانی کی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ قرآن نے افراد اور نظام کے اس تعلق کو باہمی معاہدہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی معاہدہ

درحقیقت اس نظام کی بنیاد ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو کس قدر مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9:111) عام الفاظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جماعت مومنین سے ان کے نفوس اور اموال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انہیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اس میں تین چار الفاظ تشریح طلب ہیں اور جب تک ان کی قرآنی تشریح سامنے نہیں آتی اس آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسانی معاشرہ میں خدا کا نظام' خود انسانوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جب ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے تو جو کام اس نظام کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں انہیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے مثلاً جنگ بدر میں نبی اکرم ﷺ (اپنے رفقاء کی جماعت کے ساتھ) مخالفین سے نبرد آزما ہیں۔ میدان کارزار میں تلواریں چلتی ہیں تیر اندازی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انسانوں کے ہاتھوں سے ہو رہا تھا لیکن چونکہ یہ اس نظام کے ماتحت ہو رہا تھا جو قوانین الٰہیہ کے مطابق قائم ہوا تھا۔ اس لئے خدا کا ارشاد ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8:17) تم انکی طرف تیر نہیں پھینک رہے تھے خدا تیر پھینک رہا تھا۔ قرآن کریم سے اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں لفظ اللہ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوتا ہے لہذا اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (9:111)۔ میں بھی اللہ سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون (قرآن کریم) کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ افراد معاشرہ (مومنین) اپنے نفوس اور اموال اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں جو خدا کی صفت رب العالمینی کو عام کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ نفوس میں انسان کی وہ تمام صلاحیتیں آجاتی ہیں جو اسے خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ازخود عطا ہوتی ہیں۔ اور اموال میں وہ سب کچھ آجاتا ہے جسے انسان اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرتا ہے۔

یہ تو ہوا برادران! اس معاہدہ کا ایک حصہ یعنی مومنین اپنے وہبی اور اکتسابی ماحصل زندگی کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب لیجئے اس معاہدہ کا دوسرا حصہ۔ وہ حصہ یہ ہے کہ اس کے بدلے میں یہ نظام انہیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ

ہے کہ جنت سے کیا مراد ہے۔

جنت ارضی کا مفہوم

اس مقام پر عزیزان من! یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں جنت اور جہنم کی جو کیفیت ہو گی وہ اپنی جگہ پر برحق ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کی رو سے جنت اور جہنم صرف اسی زندگی سے مخصوص نہیں۔ وہ انسان کی موجودہ زندگی میں بھی جنت اور جہنم کا ذکر کرتا ہے۔ اس دنیا کی جنت کے متعلق وہ "آدم" سے کہتا ہے کہ اس کی کم از کم خصوصیت یہ ہے کہ اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ۝ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ۝ (20:118-119) اس میں نہ تجھے بھوک کا اندیشہ ہے نہ لباس سے محروم رہنے کا ڈر۔ نہ اس میں پیاس ہے نہ سورج کی حرارت۔ یعنی اس میں خوراک' لباس اور مکان کے متعلق کسی قسم کی تشویش اور پریشانی نہیں ہو گی۔ اس میں سامان رزق اس افراط سے ہو گا کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (2:35) جہاں سے جس کا جی چاہے سیر ہو کر کھائے پیئے۔ آپ نے غور فرمایا برادران کہ اس معاہدہ کی رو سے بات کیا بنی؟ بات یہ بنی کہ افراد معاشرہ اپنی محنتوں کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور وہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی (Basic Necessities of Life) کی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے اور اس طرح خدا کی وہ ذمہ داری عملاً پوری ہوتی چلی جاتی ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ "زمین پر ہر چلنے والے کے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے۔" اور "ہم تمہیں بھی سامان زیست دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔" غور کیجئے برادران! اگر کسی معاشرہ میں ہر فرد معاشرہ کو اس کی ضمانت (Security) حاصل ہو جائے کہ وہ اور اس کی اولاد کسی حالت میں بھی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اور یہ ضمانت ایسی محکم ہو کہ لا انفصام لها وہ کبھی ٹوٹے نہیں۔ کبھی دغا نہ دے کبھی عہد شکنی نہ کرے۔ تو اس معاشرے میں انسان کی زندگی کس قدر جنتی زندگی ہو گی؟ اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب لوگوں کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ اور ان کی اولاد ضروریات زندگی سے کبھی محروم نہیں رہیں گے۔ تو انہیں مال و دولت جمع کرنے کی ضرورت کیا ہو گی اور وہ بددیانتی اور بے ایمانی کیوں کریں گے؟ انسان سمیٹتا اور جمع اس لئے کرتا ہے

کہ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو کوئی ناگہانی افتاد آپڑی تو میں اور میرے بچے بھوکے مرجائیں گے۔ کوئی ہمیں پوچھے گا نہیں۔ وہ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے سمیٹتا ہے اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے اور اس میں پھر جائز و ناجائز کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ غور کیجئے کہ جس معاشرے میں ہر فرد کی یہ کوشش ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے اس معاشرے میں زندگی کس قدر جہنم کی زندگی ہوگی۔ اس جہنم کی زندگی جس میں آج ہم سب بری طرح جل رہے ہیں اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (2:167)۔

وسائل پیداوار

اس سے برادران! یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ جس معاشرہ میں افراد معاشرہ اپنی محنت کی کمائی اور استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں بلکہ اپنے نظام کے ہاتھوں بچی ہوئی متاع سمجھیں اس میں وسائل پیداوار یا ذرائع رزق کے ذاتی ملکیت میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رزق (سامان زیست) کے وسائل کی شکلیں مختلف ہیں لیکن اگر آپ انہیں سمٹا کر پیچھے لے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اصولی طور پر رزق کا ذریعہ ایک ہی رہ جاتا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ذرائع رزق کو ارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور ارض کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وہ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ نوع انسانی اس سے ایک مدت معینہ تک فائدہ اٹھائے۔ (متاع الی حین) اور یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41:10)۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن، معاشی مشکلات کے حل کے لئے ایک نظام تجویز کرتا ہے۔ یہ نظام

1- ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جو اس حقیقت کبریٰ پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ زندگی صرف انسانی جسم کا نام نہیں بلکہ حیات کا سلسلہ جسم کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یہ سلسلہ انسانی ذات سے متعلق ہوتا ہے اور انسانی ذات کی نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی متاع جان و مال کو نوع انسانی کی

پرورش (ربوبیت) کے لئے عام کر دے۔

2- یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی بہم پہنچانے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔

3- اور اس میں ذرائع رزق افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اس نظام کی تحویل میں رہتے ہیں جو رزق کو قوانین خداوندی کے مطابق تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

●●●

کمیونزم اور اسلام

میں یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور میری نگاہیں ان دلوں کو بھانپ رہی ہیں جن میں یہ خیالات اٹھ رہے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جو کمیونزم کہتی ہے۔ اس لحاظ سے کمیونزم اور اسلام ایک ہی ہیں۔ ان حضرات سے میری گذارش ہے کہ وہ اس نتیجہ تک پہنچنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ہماری بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ کسی بات میں ذرا سی مشابہت دیکھی اور ہم نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ عین اسلام ہے۔ اقوام مغرب نے اپنے ہاں جمہوری نظام رائج کیا اور ہم نے شور مچا دیا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے کیونکہ قرآن میں لکھا ہے کہ وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (42:38)- (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے) حالانکہ مغربی جمہوریت اور اسلام کی مشاورت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح جب ہم نے دیکھا کہ کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی نفی کرتی ہے اور قرآن بھی ذرائع پیداوار پر ذاتی ملکیت تسلیم نہیں کرتا تو ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں حالانکہ (ایک ہونا تو کجا) یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ اگر اسی قسم کی جزوی مشابہتوں سے ہم نے اسلام کو دیگر نظام ہائے زندگی سے ملانا شروع کر دیا تو کچھ عجب نہیں کہ کل کو کہہ دیا جائے کہ بھارت کا سیکولر نظام بھی عین اسلام ہے کیونکہ انہوں نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے اور اسلام بھی اسے ناجائز ٹھہراتا ہے۔ یا آریہ دھرم اور اسلام ایک ہی ہیں کیونکہ آریہ سماجی بھی بت پرستی کو برا سمجھتے ہیں اور اسلام بھی

اسے شرک قرار دیتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اتنی سی مشابہت سے اسلام اور کیونزم کو ایک نہ قرار دیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی ازم (ISM) ضابطہ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے خلاف ابھری ہے تو وہ کیونزم ہے۔ کیونزم کا فلسفہ زندگی اور ضابطہ حیات کیا ہے یہ ایک طویل بحث ہے جسے ضمنی طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اس کی تفاصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب نظام ربوبیت یا تازہ تالیف انسان نے کیا سوچا؟ ملاحظہ فرمایئے۔

کیونزم کا فلسفہ

اس وقت مختصر الفاظ میں یہ سمجھئے کہ کیونزم کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ کائنات کسی نہ کسی طرح از خود وجود میں آگئی۔ اس کا نہ کوئی خالق ہے۔ نہ ہی اس کی تخلیق کا کوئی مقصد۔ اسی طرح زندگی (Life) اور شعور (Consciousness) بھی مادہ سے خود بخود پیدا ہو گئے۔ اس لئے انسانی زندگی بھی کسی پلان (Plan) کے مطابق وجود میں نہیں آئی۔ زندگی اسی طبعی زندگی کا نام ہے۔ اور جسم کے انتشار (Disintegration) کے بعد انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جائز و ناجائز اور حق و باطل کے لئے کوئی خارجی معیار مقرر نہیں۔ اس لئے مستقل اقدار (Permanent Values) کا تصور ذہن انسانی کا خود تراشیدہ ہے۔ دنیا میں ایک نظام قائم ہوتا ہے کچھ عرصہ کے بعد اس نظام میں سے اس کی ضد ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ سلسلہ تعمیر و تخریب از خود جاری رہتا ہے اس کی قوت محرکہ تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔ دور حاضر سے پیشتر سرمایہ داری کا نظام قائم تھا۔ تاریخی وجوب کا تقاضا تھا کہ اس میں سے اشتراکی نظام پیدا ہو۔ لہذا اب اشتراکی نظام کا زور ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام بھی ختم ہو جائے گا اور اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام ابھرے گا یہ ہے برادران! مختصر الفاظ میں کیونزم کا وہ فلسفہ جسے مارکس نے پیش کیا اور جس پر لینن نے روس میں عمل کر کے دکھایا۔ آپ اس فلسفہ زندگی کو دیکھئے اور اس کے بعد اس تصور حیات پر غور کیجئے جسے قرآن پیش کرتا ہے اور جس کا اجمالی سا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کے مطابق ہیں یا ایک دوسرے کی ضد! آپ شاید یہ کہہ دیں کہ جہاں تک

کیمونزم کے معاشی پروگرام کا تعلق ہے وہ تو بہرحال قرآنی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہ بھی سطح بینی اور فریب خوری ہے پروفیسر (Hawtray) نے کہا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے ممتیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبہ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

جذبہ محرکہ

آپ دیکھیں گے کہ کیمونزم کے پاس کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں جو کسی فرد کو اس پر آمادہ کر دے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی محنت کا ماحصل بطیب خاطر دوسروں کو دے دے۔ اشتراکیت کے علمبرداروں نے روس میں کیا کیا؟ انہوں نے وہاں کے مفلوک الحال مزدوروں اور نادار و محروم غریبوں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ دیکھو! یہ بڑے بڑے سرمایہ دار کس طرح تمہارا خون چوس رہے ہیں تم اٹھو اور ان کے املاک و دولت کو ان سے چھین لو۔ یعنی انہوں نے ان کے دل میں نفرت اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کیا اور اس طرح انقلاب برپا کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس پر روس کی تاریخ شاہد ہے۔ ظاہر ہے کہ نفرت اور انتقام کے جذبات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے۔ جب وہ سرمایہ دار طبقہ ختم ہو گیا جس کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات مشتعل کئے گئے تھے تو لوگوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا جو انہیں دوسروں کی خاطر کام کرنے پر آمادہ کرتا۔ اس کے لئے روس کے ارباب حل و عقد کو استبداد سے کام لینا پڑا۔ اس قسم کے استبداد سے کام لینا پڑا جس سے عوام تو ایک طرف وہاں کے لیڈر بھی چلا اٹھے۔ یہ جو آجکل اسٹالن کے جور و ستم کے واقعات منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اس میں اسٹالن کا ذاتی طور پر کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھا جس کی بنیاد نفرت اور انتقام کے علاوہ کسی تعمیری جذبہ پر نہیں تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف لینن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط قوت و استیلا' نوک شمشیر' گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

مکر و فریب

نہ صرف جور و استبداد سے بلکہ مکر و فریب سے بھی (Gollancz) اپنی کتاب (Our Threatened Values) میں لکھتا ہے کہ مشہور اشتراکی لیڈر (Dr. Lucknz) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب اور فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب دیا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

آپ کو اس جواب پر شاید تعجب ہو لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جس ضابطہ زندگی میں مستقل اقدار کو تسلیم نہ کیا جاتا ہو اسمیں ہر حربہ جس سے مقصد حاصل ہوتا ہو جائز اور بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اور خدا پر ایمان کے بغیر مستقل اقدار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے غور فرمایا حضرات! کہ کیمونزم کس طرح اس جذبہ محرکہ سے محروم ہے جو انسان کو دوسروں کی خاطر کام کرنے پر بطیب خاطر آمادہ کر دے۔ اس کے برعکس جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' قرآن اپنے نظام ربوبیت کی بنیاد ایک ایسی ٹھوس حقیقت پر رکھتا ہے جس میں ہر فرد دوسروں کی نشوونما کے لئے اس لئے مضطرب و بے قرار رہتا ہے کہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اس سے خود اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (35:18) جو (دوسروں کے لئے) سامان نشوونما مہیا کرتا ہے وہ خود درحقیقت اپنی ذات کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کے برعکس مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (47:38) جو دوسروں کو سامان زیست سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ یہ ہے برادران! وہ ایمان جس سے ایسی قوم پیدا ہو جاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) وہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی اور مشکل سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی ہے وہ قوم جس سے اس نظام خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے جو دنیا کو علی وجہ البصیرت دکھا دیتا ہے

کہ "خدا ہر متنفس کو کس طرح رزق دیتا ہے" اور وہ جنت ارضی کس طرح سامنے آجاتی ہے جس میں کوئی فرد اپنی ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اور ہر فرزند آدم کی مضمر صلاحیتیں کامل طور پر نشوونما پا لیتی ہیں۔ اسی نظام کا نام اسلامی نظام اور اس کے آئین کا نام اسلامی آئین ہے --- اگر باہں نہ رسیدی تمام بولہبی است۔

سرمایہ دار اور پیشوائیت

قرآن اسی ضمن میں یہ بھی کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت سرمایہ دار مفاد پرست طبقہ کی طرف سے ہو گی اور سخت مخالفت ہو گی لیکن انہیں آخر الامر شکست مل کر رہے گی۔ اس باب میں قرآن نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ نگہ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے' وجد و مسرت سے رقص میں آجاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت صرف سرمایہ دار طبقہ ہی کی طرف سے نہیں ہو گی بلکہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے راہ نما (Priests) بھی اس کے مخالف ہوں گے اس لئے کہ یہ طبقہ بھی مترفین میں شامل ہے یعنی ان میں جو دوسروں کی کمائی پر جیتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا ہر رسول اسی پیغام کو لے کر آیا ہے لیکن سرداران قوم اور پیشوایان مذہب نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ ارباب شریعت یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں کہ یہ شخص تمہیں اس روشن زندگی سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے جس پر تمہارے اسلاف چلتے تھے۔ اس لئے تم اس کی بات بالکل نہ ماننا۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا کہ مفاد پرست طبقہ اس پیغام کی مخالفت میں براہ راست سامنے نہیں آتا بلکہ ارباب مذہب کو آگے بڑھاتا ہے اور خود ان کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ داستان بنی اسرائیل میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ فرعون کی طرف گئے اور اس سے کہا کہ خدا کے بندوں کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تو اس نے دو چار باتوں کے بعد اس خطرہ کا اندازہ کر لیا جو اس پیغام میں پوشیدہ تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے مہامنتری (Head Priest) ہامان کو بلایا اور کہا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر کو تیار کرکے لائے اور حضرت موسیٰؑ کا مقابلہ کرے۔ یعنی وہ خود تو پیچھے ہٹ گیا اور ضرب کلیمی کے مقابلے کے لئے پیشوائیت کو سامنے لے آیا۔ مفاد پرست گروہ ہمیشہ سے یہی کرتا چلا آیا ہے اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ ملوکیت اور برہمنیت کا یہی وہ گٹھ جوڑ ہے جو انسانیت کے لئے تباہ کن

موجب بنتا چلا آرہا ہے۔ برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار بتاتا ہے اور راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت) کو اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ قیصر پوپ کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے اور پوپ قیصر کے حقوق الوہیت (Divine Rights) کی سندیں تراشتا ہے۔ مقصد دونوں کا یہ ہوتا ہے کہ غریبوں اور ناداروں کو جہالت آمیز افیون پلا کر مدہوش رکھا جائے اور ان کی گاڑھے پسینہ کی کمائی پر عیش اڑائے جائیں۔ آپ دیکھئے قرآن کریم کس طرح ان دونوں گروہوں کا ذکر ایک ہی سانس میں کرتا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ ٱلْأَحْبَارِ وَٱلرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ ٱلنَّاسِ بِٱلْبَٰطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ (9:34)۔ اے افراد جماعت مومنین! تم نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے یاد رکھنا کہ ارباب شریعت اور ارکان طریقت کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں اور ہر وقت اس قسم کے حربے تلاش کرتے رہتے ہیں جس سے لوگ اس راستہ کی طرف نہ جا سکیں جو خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ اس آیت کا پہلا حصہ ہے۔ اس کے بعد ہے وَٱلَّذِينَ يَكْنِزُونَ ٱلذَّهَبَ وَٱلْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (9:34) اور یہ سرمایہ دار گروہ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ مال و دولت کے انبار در انبار سمیٹ کر جمع کرتے رہتے ہیں اور اسے نوع انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ (اے رسول) تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ سوائے درد انگیز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو گا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کس حتم و یقین سے کہا ہے کہ نظام سرمایہ داری کا انجام درد انگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں خواہ مذہبی پیشوائیت اس کے تحفظ کے لئے کتنے ہی تعویذ کیوں نہ لکھے۔ قرآن نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر اس قدر واضح الفاظ میں دہرایا ہے کہ اس انقلاب کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ تو ایک طرف ابہام تک بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا کائناتی قانون خود اس انقلاب کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ تم دیکھتے نہیں کہ ہم کس طرح زمین کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟ اس کے ساتھ ہی اس نے کہا ہے کہ کائناتی قانون کے ذریعے سے انقلاب

بڑے طویل عرصہ میں جا کر ظہور پذیر ہوا کرتا ہے۔ اور خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ یہ انقلاب جلد رونما ہو جائے تو تم اس کے لئے کوشش کرو اور کائناتی قانون کے رفیق و معاون بن جاؤ۔ پھر یہ انقلاب "دنوں کی مدت" میں تمہارے سامنے آ جائے گا۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (47:6) محمد رسول ﷺ والذین معہٗ نے بھی یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ چند دنوں کے اندر دنیا کے سامنے آ گیا تھا۔

ہمارا موجودہ مذہب

جو معاشرہ حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا اس میں نہ سرمایہ داری کا نام و نشان تھا نہ مذہبی پیشوائیت کا کوئی پتہ سراغ۔ لیکن جب حضور ﷺ کی وساطت سے ملے ہوئے دین کی جگہ اس مذہب نے لے لی جو ہمارے دور ملوکیت میں وضع ہوا تھا تو اس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت دونوں "عین دین" بن گئے۔ یہی وہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جو اس وقت تک ہم میں رائج ہے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ غیر مسلم دنیا اپنے عقلی تجربات کی بناء پر سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت سے کنارہ کشی اختیار کئے چلی جارہی ہے لیکن مسلمانوں کے ممالک انہیں اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں اور اگر کہیں سے اس کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو مذہبی راہ نما اپنی پوری قوتوں سے مفاد پرستی کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور عوام کے جذبات کو اسی پرانے حربہ سے مشتعل کردیتے ہیں کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (34:43) یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے طریقے سے ورغلا کر کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن برادران! ان کے اس قسم کے حربوں سے یہ انقلاب خداوندی رک نہیں سکتا۔ اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا (22:7) یہ انقلاب یقیناً آکر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

مقصد پیش نظر

جی یہ چاہتا ہے برادران! کہ یہ قرآنی انقلاب اس قوم کے ہاتھوں سے رونما ہو جو خدا کی اس انقلاب آفریں کتاب پر ایمان رکھنے کی دعویدار ہے اور اس کی عملی تجربہ گاہ پاکستان کی سرزمین بنے جسے ہم نے خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے حاصل کیا ہے۔ میری یہی کوشش ہے اور اس کے لئے میں اس قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ میری استدعا یہ ہے کہ آپ میں سے جو خود قرآن پر غور و فکر کے بعد مجھ سے متفق ہوں وہ اس قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے میرا ساتھ دیں یا جس طریقہ سے وہ مناسب سمجھیں اسے عام کریں۔ چہ عجب کہ اس طرح یہ سرزمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے اور امامت امم کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا وہ ملت پاکستانیہ کے حق میں پورا ہو جائے۔

●●●

سوالات

خطاب کے بعد مختلف لوگوں کی طرف سے سوالات پوچھے گئے۔ یہ سوال اور ان کے مختصر جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

سوال نمبر 1- ہم غریب اس آسرے پر جیتے ہیں کہ اس دنیا میں ہم مصیبتوں میں زندگی بسر کر لیں اگلی دنیا میں تو جنت ہمارے لئے ہو گی۔ آپ نے وہ جنت بھی ہم سے چھین لی۔ یہ تو بڑا ظلم ہے؟

جواب۔ یہ جنت میں نہیں چھین رہا۔ جب قرآن بھوک کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے تو میں اسے کس طرح اس کی رحمت قرار دے دوں۔ بات یہ ہے کہ قرآن کسی کے غلط جذبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَآ أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتٰبِ (4:123) نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہو گا اور نہ ہی تمہارے فریق مخالف (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق ہو گا۔ سب کچھ خدا کے اٹل قانون کے مطابق ہو گا اور اس

کا اٹل قانون یہی ہے کہ مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (17:72) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہو گا۔ اتنا اور عرض کر دوں کہ کسی ہنگامی حادثہ سے کسی فرد یا قوم کا وقتی طور پر مفلوک الحال ہو جانا اور بات ہے اور اس کا اس مفلسی اور فلاکت کو خدا کی رحمت سمجھ کر اس حالت پر مطمئن ہو جانا اور بات۔ دُنیا اور آخرت کی رسوائی اس دوسری صورت کا لازمی نتیجہ ہے۔

سوال نمبر 2- اعمٰی کے معنی عقیدے کی گمراہی ہے اس کا معاشی معاملات سے کیا تعلق ہے؟

جواب۔ قرآن نے معاشی معاملات کے ساتھ اس کا گہرا تعلق بتایا ہے۔ سورہ طٰہٰ میں ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی (20:124) جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا ہم اس کی روزی تنگ کر دیں گے اور قیامت میں اسے اعمٰی (اندھا) اٹھائیں گے۔ نیز خود سورہ بنی اسرائیل میں جہاں یہ آیت آئی ہے کہ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (17:72) اس سے پہلے انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰی كَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا (17:70) لہٰذا خوشگوار رزق سے محرومی اور دیگر مخلوق کے مقابلے میں عدم سرفرازی اعمٰی ہونے کی دلیل ہے۔

سوال نمبر 3- اس اعتبار سے تو اقوامِ یورپ جنہوں نے قوائے فطرت کو مسخر کر لیا ہے۔ مومنین کی جماعتیں قرار پا جائیں گی؟

جواب۔ اقوامِ یورپ نے خدا کے طبعی قانون پر عمل کیا ہے اور وہ اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہیں مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (17:20)۔ خدا نے اپنے عطیات کے آگے دیوار نہیں کھینچ دی کہ کسی قوم کے لئے اس کے پھاٹک کھول دیئے جائیں اور کسی کو اس سے روک دیا جائے۔ اس کے قوانینِ طبعی پر جو قوم بھی عمل پیرا ہو گی وہ اس کے نتائج سے

شرباب ہو جائے گی۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ
(17:20) لیکن اتنے سے کوئی قوم مومن نہیں قرار پا جاتی۔ مومن وہ ہے
جو خدا کے طبعی قوانین کے ساتھ اس کے انسانیت سے متعلق قوانین
(مستقل اقدار) پر بھی عمل پیرا ہو۔ یہ قوانین قرآن کریم کے اندر ہیں۔
صورت یہ ہے کہ۔

(1) جو قوم خدا کے طبعی قوانین پر عمل پیرا ہوتی ہے اسے طبعی کائنات کے مفاد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

(2) جو قوم طبعی قوانین کے ساتھ مستقل اقدار پر بھی عمل پیرا ہوتی ہے اسکا حال بھی روشن ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔ اور

(3) جو قوم نہ طبعی قوانین پر عمل کرتی ہے نہ مستقل اقدار پر اس کا حال بھی تاریک ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

سوال نمبر 4۔ تم نے قرآن کی آیت اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ (13:41) کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ خدا زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتا جا رہا ہے۔ یہ یکسر تحریف اور الحاد ہے۔ تم نے اس سے قرآن کو پاژند بنا دیا ہے قرآن میں مِنْ اَطْرَافِهَا ہے اس میں سرداران قوم کا کہیں ذکر نہیں۔

جواب۔ آپ عربی کی کوئی مستند لغت اٹھایئے اور اس میں دیکھئے کہ اطراف کے معنی سرداران قوم دیئے گئے ہیں یا نہیں۔

سوال نمبر 5۔ آپ نے ہر جگہ قانون خداوندی کی اطاعت کا ذکر کیا ہے اس سے خدا کہیں باقی نہیں رہتا۔ صرف اس کا قانون رہ جاتا ہے۔ یہ تو خدا کا انکار ہے۔

جواب۔ آپ جب قرآن کی اطاعت کرتے ہیں تو اسے خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو کتاب اللہ کی اطاعت ہے خدا کی اطاعت نہیں تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ کیا کتاب اللہ کی اطاعت سے

(معاذ اللہ) خدا کا انکار ہو گا؟ کتاب کے معنی بھی قانون ہی ہیں اس قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک قانون طبعی ہے جو خارجی کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ضروری ہے۔ دوسرا قانون انسان سے متعلق ہے اور مستقل اقدار پر مشتمل۔ وہ قانون یہ ہے کہ انسان طبعی قوانین کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور انکے حاصل کو قرآنی قانون کے مطابق نوع انسانی کی نشوونما کے لئے صرف کرے۔ فرمایئے یہ خدا کا انکار ہے یا اس کا صحیح صحیح اقرار؟ یاد رکھئے اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق صرف اس کے قانون کے ذریعے سے ہے۔ لہٰذا اس کے قانون کی اطاعت عین اطاعت خداوندی ہے اس کی اطاعت کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں۔ نہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔

سوال نمبر 6- کیا رسول اللہ کے زمانہ میں بھی افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظام کے سر تھی؟

جواب۔ اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قرآن کے مطابق عمل فرمایا تھا اس لئے اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ قرآن کی رو سے افراد معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظام پر ہے تو حضور ﷺ نے جو نظام متشکل فرمایا تھا اس میں بھی لامحالہ یہی صورت ہو گی۔ اتفاق سے اس کے لئے ہمارے پاس تاریخی شہادت بھی موجود ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تمام افراد مدینہ کے وظائف مقرر تھے۔ یہی وہ وظائف تھے جو پہلے بچے کے دودھ چھڑانے کے بعد سے دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان کے متعلق بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ وہ بچے کے ساتھ ہی ملنے لگ جایا کریں۔

سوال نمبر 7- کیا خلافت راشدہ میں زمینیں حکومت کی مشترکہ تحویل میں تھیں؟

جواب۔ اس سوال کا اصولی جواب وہی ہے جو میں نے سابقہ سوال کے

جواب میں عرض کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق وغیرہ کی مفتوحہ زمینیں افراد میں نہ بانٹی جائیں بلکہ حکومت کی تحویل میں رہیں اس ضمن میں اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشوونما پانے کے اسباب و ذرائع کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت اس اہم فیصلہ کی سرانجام دہی کے لئے زمانہ کے احوال و ظروف کے مطابق عملی تدابیر خود طے کرے گی۔ قرآن نے اس کے لئے اصول یہ دیا ہے کہ ذرائع پیداوار تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلے رہنے چاہئیں اور فاضلہ دولت (Surplus Money) کسی کے پاس نہیں رہنی چاہیے۔

سوال نمبر ۸۔ آپ نے جو کچھ کہا ہے ہم اس سے متفق ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ موجودہ حالات میں اس قرآنی انقلاب کے لئے کیا قدم اٹھایا جائے۔

جواب۔ اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ اس کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیجئے۔ جو لوگ قرآن کے اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا عملی قدم اٹھایا جائے لیکن جو قدم بھی اٹھایا جائے وہ کسی حال میں بھی حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے۔

دین کا نظام قائم کس طرح ہوتا ہے

1۔ ایک آزاد مملکت اس امر کا اعلان کرے کہ اس کا تمام کاروبار' قرآنِ کریم کے مطابق ہو گا۔

2۔ قرآنِ کریم میں کچھ احکام و قوانین' متعیّن شکل میں دیئے گئے ہیں اور بعض اقدار' اصول کے طور پر بیان ہوئی ہیں۔ قرآن کے احکام و قوانین ہوں یا اصول و اقدار' سب غیر متبدّل ہیں اور تمام مسلمانوں پر ہمیشہ کے نافذ العمل رہنے کے لئے دی گئی ہیں۔

3۔ جن اقدار کے صرف اصول دیئے گئے ہیں' مملکت کے اربابِ فکر و نظر' نمائندگانِ ملّت' ان اصولوں کی روشنی میں' اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق' ان کے جزئی قوانین مرتّب کریں گے۔ ایسا کرنے میں وہ احادیث' تاریخ' فقہ کو اپنے سامنے رکھیں گے اور ان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق' قوانین مرتّب کریں گے۔ جو کچھ پیچھے سے چلا آ رہا ہے' اس میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہیں اور جو ہمارے زمانے کی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں' انہیں ایسے ہی رہنے دیا جائے گا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہو گی' ان میں تبدیلی کر لی جائے گی۔ جہاں نئے قانون کی ضرورت ہو' نیا قانون بنا لیا جائے گا۔ اس طرح قرآن کے اصول غیر متبدّل رہیں گے اور اُن کے اندر وضع کردہ قوانین' زمانے کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ' بدلتے جائیں گے۔ یوں مستقل اور قابلِ تغیر و تبدّل عناصر کے حسین امتزاج سے' کاروانِ ملّت آگے بڑھتا چلا جائے گا۔

4۔ دین کا مقصد' انسان کے اس دنیا کے معاملات کو اس طرح حل کرنا ہے کہ اس سے وہ فساد (ناہمواری) ختم ہو جائے جس کی وجہ سے افراد اور

اقوام اس بری طرح جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں اور اس کے ساتھ ہی افراد کی ذات کی نشو و نما اس طرح ہوتی جائے کہ وہ موت کے بعد کی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اگر اس سے یہ نتائج مرتب نہیں ہوتے' تو ہمیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس میں کہیں خرابی ہے۔ اس خرابی (یا خرابیوں) کا سُراغ ہمیں قرآنِ کریم کی روشنی میں مل سکتا ہے۔ میری حقیر کوششوں سے مقصود یہ ہے کہ ہم ان خرابیوں کا ازالہ کر کے دین کے نظام کو انہی خطوط پر **متشکل** کر سکیں جن پر یہ حضور رسالت مآبؐ کے عہد مبارک میں استوار ہوا تھا۔

اس کے ساتھ اتنا اور سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک وہ نظام قائم نہ ہو' (جسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے) اس وقت تک اُمّت جس جس طریق سے اسلام کے ارکان کو ادا کرتی چلی آ رہی ہے' اس میں نہ کوئی تبدیلی کی جائے اور نہ ہی کوئی نیا طریقہ وضع کیا جائے۔ اس سے خواہ مخواہ مزید اختلاف اور انتشار پیدا ہو گا۔ البتہ جو نظریات و تصوّرات یا رسوم اور رواج قرآن کے خلاف رائج ہیں' ان کی بابت یہ بتایا جائے کہ یہ قرآن کے خلاف رائج ہیں' اور قرآنی نظام کی صحیح شکل کو اُجاگر کر کے امت کو اس طرف آنے کی دعوت دی جائے۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا' تو یہ اس کا فریضہ ہو گا کہ دیکھے اور فیصلہ کرے کہ مسلمانوں کے موجودہ اختلافات کو مٹا کر اُن میں پھر سے وہ وحدت فکر و عمل کیسے پیدا کی جائے جو عہدِ رسالتمآبؐ میں وجۂ تابیدگی مِلّت تھی۔ میری کوشش بس اتنی ہے۔

پرویز